# امام شناسی، علم تاریخ اور علم کلام کی روشنی میں

# *IMAMOLOGY_ FROM THE VIEWPOINT OF HISTORY & THEOLOGY*

***Dr. Hassan Hazti***

***Translation: Dr. Qaiser Abbas Jafri***

***Abstract:***

*According to the belief of the Shia Muslims, their Imams are endowed with some superhuman qualities, such as knowledge of the unseen, infallibility and miracles, etc. Shia believe in this. But, history is a knowledge that is based on scientific methodology. Therefore, instead of considering the superhuman perfections associated with the Imams, it emphasizes the historical facts that the youth are connected with human characteristics. On the other hand, superhuman qualities are most preferred by theologians. The most important issue in this article is how the supernatural actions and miracles of the Shia Imams can be proved to be natural and regular through a historical study.*

***Key words**: Imam, Shia, History, Theology, Superhuman.*

**خلاصہ**

شیعہ مسلمانوں کے عقائدکے مطابق بارہ امامؑ ایسے مقدس مرتبہ کے حامل ھیں کہ جو انھیں بعض مافوق انسانی خصوصیات سے بھرہ مند کرتا ھے،جیسا کہ علم غیب ، عصمت اور صاحب کرامات ھونا وغیرہ ۔ شیعوں کا اس پر کامل یقین ہے۔ لیکن علم تاریخ سائنسی طریقہ کار پر مبنی علم ھے۔ اس لئے یہ آئمہ طاھرینؑ سے مربوط مافوق انسانی کمالات پر غور کرنے کی بجائے ان تاریخی حقائق پر تاکید کرتا ھے کہ جوانسانی خصوصیات سے مربوط ھیں۔ دوسری طرف، متکلمین کے لئے مافوق انسانی صفات بیشتر پسندیدہ ھیں۔ اس مقالہ میں مھمترین مسئلہ یہ ھے کہ ایک تاریخی تحقیق کے ذریعے آئمہؑ کے مافوق انسانی افعال اور معجزات وغیرہ کو کس طرح طبیعی اور قاعدہ مند ثابت کیا جا سکتا ھے؟

**کلیدی کلمات:** امام، شیعہ، تاریخ ، علم الکلام، مافوق انسانی۔

## مقدمہ مترجم

اکثر دانشوروں کا خیال ھے کہ معلومات کی جمع آوری(Data collection) کو ریسرچ ورک کا نام پر پیش کرنا لفظ تحقیق کا مذاق اڑانا ھی نھیں، بلکہ نئے محققین کو گمراہ کرنے اور علم کی تولید (Production of Knowledge) کا دروازہ بند کرنے کے مترادف بھی ھے۔ لھذا معلومات کی جمع آوری سے یہ بہتر ہے کہ مختلف زبانوں میں انجام دی گئی اچھی، مفید اور بھترین تحقیقات کو اپنی زبان میں ترجمہ کر کے علمی حلقوں کے مطالعہ کی نظر کر دیا جائے تاکہ ملک و قوم کی خدمت اور علم و دانش پر احسان کے ساتھ ساتھ مختلف قوموں اور زبانوں کے ماھرین کے افکار سے اپنے محققین کو بھی آشنا کیا جاسکے۔ اسی نظریہ کے پیش نظر مترجم نے موضوع اور مطالب کے اعتبار سے ایک نہایت منفرد اور غنی تحقیق کو اردو زبان دانشوروں، محققین اور طلباء کی خدمت میں پیش کیا ھے۔ یہ مقالہ تھران یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر حسن حضرتی کا ریسرچ ورک ھے جو انبیاء اور آئمہ طاھرین علیہم السلام کی ثبوتی اور اثباتی شان کے موضوع پر بحث کرتا ہے۔ یقینا اس مقالے کا ترجمہ اردو زبان مؤرخین، متکلمین اور طلباء کو علمِ تاریخ اور علمِ کلام کے اشتراک سے ایک نئی جہت سے متعارف کرائے گا۔ اس ترجمہ میں کوشش کی گئی ھے کہ اصلی مفاھیم اور مطالب کو نھایت امانتداری کے ساتھ منتقل کیا جائے۔ البتہ بعض مقامات پر اپنے قارئین کے ذوق کو ملحوظ خاطر رکھتے ھوئے کچھ اضافی مطالب کو نظر انداز اور کچھ دیگر مفاھیم کی جگہ بدل دی گئی ھے، جیسا کہ اصلی مقالہ کے خلاصہ کا دوسرا پیرا گراف خلاصہ کے حجم میں اضافہ کے پیش نظر ، مسئلہ تحقیق کے ذیل میں فٹ نوٹ میں بیان کیا گیا ھے وغیرہ۔ جو لوگ جانتے ھیں انھیں معلوم ھے کہ فارسی زبان میں ڈاکٹر حسن حضرتی کا قلم نھایت سنگین ھے کہ جسے سمجھنے میں اھل زبان کو بھی بعض اوقات لغت سے مدد لینا پڑتی ھے۔ لھذا مجھے بھی متعدد مرتبہ یہ زحمت اٹھانا پڑی اور کئی ایک لغات کی مدد سے پیچیدہ جملات اور مشکل الفاظ کا ادراک حاصل کرنے کے بعد انھیں اپنی زبان میں منتقل کیا ھے۔ لہذا میں سمجھتا ھوں کہ اس ترجمہ میں ابھی بھی کمی اور بہتری کا امکان موجود ھے کہ جس پر ارباب دانش اور خصوصاًاھل زبان سے معذرت کے ساتھ ملتمس ھوں کہ وہ مجھے میری علمی اور ادبی خامیوں کی نشاندہی کا تحفہ دے کر احسان فرمائیں گے۔

## 1-تاریخ شناسی

تاریخ شناسی ایک ایسا علم ھے کہ جس کی مھمترین خصوصیت انسانی زندگی سے مربوط حوادث اور واقعات کو طبیعی، مادی اور سائنسی طریقہ کار سے دیکھنا ھے لھذا یہ علم ان تمام ابزار و وسایل کو بروئے کار لاتے ھوئے کہ جو مورخین کے ھاں رائج ھیں، موضوعات کو بالکل سائنسی نقطہ نظر سے دیکھتے ھوئے معجزات، کرامات اور علم غیب وغیرہ کی تصدیق نھیں کرتا ھے ۔ اسی لئے ان موضوعات کو علم کلام کی ابحاث شمار کرتے ھوئے ان سے چشم پوشی کرتا ھے لھذا علم تاریخ صرف اس حقیقت پر یقین رکھتا ھے کہ جو مادی انداز میں زمین پر واقع ھوئی ھو، اور بقیہ مافوق الطبیعت اور خارق عادات کو کسی بھی صورت نھیں مانتا ھے، اس طرح مورخین کے نزدیک کسی شخص کا با کرامت، صاحب معجزات یا روحانی شان کا حامل ھونا وغیرہ اس قدر تائید شدہ نھیں جتنا کہ متکلمین کے ھاں ھے۔ کیونکہ وہ ان صفات کو الھی نصرت اور غیبی طاقت کے ضمن میں شمار کرتے ھوئے انھیں آئمہ طاھرینؑ کی سب سے بڑی شان تصور کرتے ھیں جبکہ مورخین ان کی کامیاب مادی زندگی کو ان کی عظمت تصور کرتے ھیں۔

## 2- بیان مسئلہ

علم تاریخ ایک ایسا علم ھے کہ جس کا ھدف اپنے پیش نظر موضوعات کی سائنسی شناخت حاصل کرنا ھے۔لھذا مورخین کے پیش نظر ایسے موضوعات ھوتے ھیں کہ جوبالکل طبیعی، مادی اور سائنسی طرز کے ھوں کہ جن کو سمجھنا اور درک کرنا ھر عام و خاص کے لئے ممکن ھو۔ البتہ بعض اوقات مورخین کچھ ایسے تاریخی موضوعات کو بھی مورد بحث قرار دیتے ھیں کہ جو اگرچہ ماضی اور گذشتہ زمانے سے مربوط ھوتے ھیں لیکن اپنی نوعیت کے اعتبار سےطبیعی اور مادی نھیں ھوتے یھی وجہ ھے کہ تاریخی نقطہ نظر سے ان موضوعات کا سمجھنا ھر شخص کےبس کی بات نھیں۔ کیونکہ معجزاتی حیثیت کے حامل انسانوں (آئمہ طاھرینؑ) کے خارق العادت افعال و اعمال جوکہ طبیعی طور پر مادی دنیا میں محقق ھوچکے ھیں، تاریخی موضوعات شمار ھوتے ھیں اس لئے بعض

مرتبہ مورخین ان کی شناخت حاصل کرنے کے لئے تیار ہو جاتےھیں۔ لھذا تاریخ بشریت میں معجز نما ھستیوں سے مربوط تحقیق کرنا درحقیقت انھی مافوق طبیعی موضوعات کو زیربحث لانا ھے کہ جو مورخین کے دائرہ کار سے باھر ھیں۔ البتہ تاریخ میں جو کچھ ان بزرگ ھستیوں کے ھاتھوں انجام پا چکا ھے وہ سب کا سب طبیعی اور عمومی نھیں، بلکہ ان کے بھت سارے امور معجزاتی اور غیر طبیعی تھے، اس لئے کھا جا سکتا ھے کہ ان کی تمام تر خصوصیات عام انسانوں جیسی نھیں تھیں، بلکہ وہ عمومی انسانی خصوصیات کے ساتھ ساتھ آفاقی خصوصیات کے حامل بھی تھے: جیسے معجزہ کرنا، کرامات دیکھانا، غیب کی باتیں کرنا،ھر طرح کے گناھوں سے معصوم اور پاک ھونا اور خدا وند متعال کے ساتھ گھرا رابطہ ھونا وغیرہ کہ جنھیں تاریخی طریقہ کار سے ثابت کرنے کی ضرورت ھے۔ یقیناً ایسے اعتقادات کے بارے میں خود شیعہ علماء کے درمیان بھی اختلافات پائے جاتے ھیں کہ جن کا ذکر حتی قدیمی ترین بزرگ علما کے ھاں بھی قابل مشاھدہ ھے کہ جس کا بیان اس تحریر میں ضروری نھیں ھے۔ کیونکہ یہ موضوع نہ تو اس تحقیق کا مسئلہ ھے اور نہ ھی اسے بیان کرنے کی گنجایش ھے۔ البتہ محقیقن بیشتر آگاھی حاصل کرنے کے لئے ذیل میں دی گئی کتب کی طرف رجوع کریں:

1. محمد، ابراهیم نعماني، *الغیبه*( تهران، مکتبه الصدوق، 1379) 44-
2. شیخ، صدوق، *معاني الاخبار*( قم، انتشارات جامعه مدرسین حوزه علمیه قم، 1361) 132-
3. پیشین، *کمال الدین و تمام النعمه*، ج2 ( قم، دارالکتاب الاسلامیه، 1359 ق) 361 و 5-
4. شیخ، مفید، *تصحیح الاعتقادات الامامیه*( بیروت: دارالمفید، 1414 ق) 128-
5. ابوالصلاح، حلبي، الکافي في الفقه، تحقیق: رضا استادي( اصفهان، مکتبه امیرالمومنین، 1403 ق) 174-
6. محمد بن حسن، طوسي، الاقتصاد الهادي الي طریق الرشاد، تحقیق: حسن سعید( تهران، مکتب جامع چهل ستون، 1400 ق) 113-

لہذا مسألہ یہ ھے کہ کیا مورخین کے بس میں ھے کہ وہ ایسے انسانوں کی طبیعی اور مافوق طبیعی یا مادی اور معنوی زندگی کے درمیان عقلی اور منطقی رابطہ برقرار کر سکیں کہ علم تاریخ سائنسی طریقہ کار سے جس کی تائید اور تصدیق کرے، اور ان مقدس شخصیات کی پھچان اور معرفت مذکورہ بالا دونوں پہلوؤں سے ھونے پائے ناکہ ایک پھلو کو نظر انداز کرتے ھوئے دوسرا متعارف کروا دیا جائے یا دونوں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں لاکر کھڑا کر دیا جائے وغیرہ؟ کیا ان دونوں خصوصیات (مقام اثباتی اور مقام ثبوتی) کا تاریخی نکتہ نظر سے ایک مقام پر اکٹھا ھونا ممکن ھے؟ یا یہ کہ مجبوراً ایک خصوصیت کو ثابت کرنے کے لئے دوسری کی سرے سے نفی کرنی پڑے گی؟ دوسرے الفاظ میں کیا یہ ممکن ھے کہ ائمۂ کے مقام ثبوتی اور مقام اثباتی کو تاریخی تحقیقی نکتہ نظر سے ثابت کیا جائے یا پھر یہ کہ تاریخی روش کے مطابق ان کے مقام ثبوتی کو نظرانداز کرکے مقام اثباتی پر ھی اکتفا کر لیا جائے؟ اور اگر ایسا کر لیا جائے تو پھر ایسا ممکن ھے کہ ایک امام معصوم کو اس کی صحیح تعریف کے مطابق پھچانا جا سکے جبکہ ان کی کرامات، معجزات، عصمت اور علم غیب جیسی خصوصیات سے چشم پوشی کی گئی ھو؟ کیا ایسی امام شناسی حقیقی اورواقعی امام شناسی ھو سکتی ھے؟ جو کچھ مذکورہ بالا سطور میں بیان کیا گیا ھے اس کے پیش نظر اس تحقیق کے اصلی سوال کو اس طرح بیان کریں گے کہ: تاریخی تحقیق میں کس طرح معجز نما انسانوں کے مقام ثبوتی اور مقام اثباتی کو ایک ساتھ بیان کیا جا سکتا ھے تاکہ ان کی ذات کی حقیقی ، صحیح اور مکمل معرفت اور شناخت حاصل ھو سکے؟ اگر یہ اختلاط ممکن ھے تو کس طرح اور اگر ممکن نھیں تو کیوں اور کیسے؟ یہ اس صورت میں ھے کہ ان ھستیوں سے وابستہ مقام اثباتی (عام انسانوں کے ساتھ مشترک ھونا) علم تاریخ کے زمرے میں آتا ھے جبکہ مقام ثبوتی (عام انسانوں سے منفرد ھونا) مکمل طور پر علم کلام کی بحث شمار کی جاتی ھے۔ اس لئے اس تحقیق میں کوشش کی گئی ھے کہ

دونوں علوم کی جداگانہ تعاریف کرتے ہوئے مذکورہ بالا شخصیتوں کی درست اور صحیح معرفت حاصل کی جائے، ایسی معرفت جوکہ بنی نوع انسان کے مفید ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرہ سازی کر سکے۔

## 2۔ علم تاریخ کی تعریف اور اس کا دائرہ کار

شایدمشکل ترین کام کسی علم کی صحیح اور دقیق تعریف کرنا ھے۔ لھذا اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے ان سطور کا مؤلف اس کوشش میں ھے کہ علم تاریخ کی شناخت حاصل کرتے ہوئے اس کی صحیح تعریف کرے تاکہ اس علم کی معرفت کے ساتھ اس کی حدود و قیود کا تعین کیا جا سکے۔ قدیمی دانشوروں کے نزدیک علم تاریخ کو مخصوص معانی اور مفاہیم تک محدود نہیں رکھا گیا ھے اور نہ ھی ان کے ھاں اس علم کا کوئی ایک معنا سمجھا جاتا ھے۔ اس لئے سقراط نے اسے (علم تاریخ کو) شناخت کےمعنوں میں لیا، ارسطو نے کہا تاریخ ماضی کے واقعات اور ان کی اسناد کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کا نام ھے۔ [1]البتہ ان کے درمیان ایک گروہ وہ بھی ھے جوکہ بالکل علم تاریخ کی کسی تعریف کا قائل ھے ھی نہیں، لھذا وہ کہتےھیں کہ یہ علم نہ تو کسی خاص موضوع تک محدود ھے اور نہ ھی اس کی حدود اور دائرہ کار کا تعین کیا جا سکتا ھے، مثلاً: شوپنھاور معتقد تھا کہ: بنیادی طور پر تاریخ ایک اعلی طبقہ بندی کا نام ھے کہ جس کی دوسرے علوم کی طرح کوئی خاص تعریف اور وقت کی قید لگا کر طبقہ بندی نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے وہ علم تاریخ کے موضوع کو بھی کبھی نہ ختم ہونے والا موضوع بیان کرتا تھا، اس لئے اسے کسی خاص موضوع تک محدود رکھنے کا قائل نہیں تھا۔[2] لھذا اگر ھم قدیمی مورخین کی روش پر چلتے ہو ئے یہ کام انجام دینا چاھیں، تو پھر ضروری ھے کہ ھم اپنی تعریف کو موضوع، روش اور ھدف علم تاریخ جیسے تین پایوں پر استوار کریں۔

ان سطور کے مؤلف اور دیگر مورخین کی نظر میں علم تاریخ کا موضوع انسان ھے۔ کیونکہ جھاں کھیں انسان ہو گا وھیں تاریخ بھی ہو گی اور جھان انسان نہیں وھاں تاریخ بھی نہیں ہوگی۔ لھذا تاریخ کا اصلی اور مستقل موضوع انسان ھے اور اس کے علاوہ باقی تمام موضوعات مورخین کے نزدیک ثانوی حکم میں آتے ھیں اسی لئے وہ زیادہ اھمیت کے حامل نہیں ھیں۔ پس تاریخ شناسی سے مراد وہ علم، کہ جو صرف انسان اور اس کے افعال کے گرد گھومتا رھتا ھے۔ اگر تاریخ میں غار حرا، چاہ زم زم یا حجر اسود کی اھمیت ھے تو اس کی وجہ ان کا کسی انسان کے ساتھ وابستہ ہونا ھے اور اس کے قدموں کے نشانات کی برکت سے ھے۔ ورنہ وہ خود اس قابل نہیں کہ مورخین کی توجہ کو اپنی طرف مرکوز کر سکیں۔ اس طرح جو کچھ عالم مادہ میں واقع ہوا اور انجام پا چکا ھے وہ سارے کا سارا علم تاریخ کے موضوع میں شمار نہیں ہوتا۔ لھذا یہ وہ مقام ھے کہ جھاں پر طبیعت اور ماضی کا تاریخی مفاھیم کے ساتھ فرق واضح اور آشکار ہوتا ھے۔

سوشل سائنسز کے ماھرین اور انسانی علوم کے مفکرین شاید اٹھارویں صدی عیسوی میں تاریخ اور طبیعت کے دو الگ الگ مفاھیم ہونے کے قائل ہوئے ھیں جبکہ اس سے پھلے وہ تاریخ اور طبیعت کے مفاھیم کو ایک ھی تصور کرتے ہوئے ان کے مابین کسی قسم تفاوت کے قائل نہیں تھے۔ جیسا کہ کانٹ تاریخ اور طبیعت کے بارے میں اسی نظریہ کا قائل تھا[3]:وہ کھا کرتا تھا کہ اگر تاریخ ایک منظر کا نام ھے، تو پھر وہ واضح اور آشکار ھے اور جب وہ منظر واضح اور آشکار ھے تو اسی کا نام طبیعت ھے۔ لھذا طبیعت ایسی چیز کا نام ھے کہ جو ایک منظر کی طرح دکھا دی گئی ہو۔ یوں اٹھارویں صدی کے مفکرین تاریخ کو ایک منظر کی طرح دیکھتے ہوئے تاریخ کو طبیعت کے ماتحت تصور کرتے ھیں، اس کے علاوہ وہ تاریخی ایام کو منٹسکو کی نظر میں، جغرافیا اور اقلیم شناسی کے ماتحت، یا ھرڈر کی نظر میں، اسے انسان شناسی کے قوانین کے تابع تصورکرتے ھیں[4]۔ لیکن انیسویں صدی کے مفکرین نے اس موضوع پر اپنا نکتہ نظر بدلتے ہوئے اس کے برعکس نظریہ پیش کیا ھے۔ جیسا کہ ھگل تاریخ اور طبیعت کے درمیان ایک بنیادی تفاوت کا قائل ھے لھذا اس کا

اصرار ھے کہ طبیعت اور تاریخ دو بالکل جدا اور مختلف چیزیں ھیں کہ جو کسی بھی صورت میں ایک نھیں پس وہ طبیعت اور تاریخ کے درمیان واضح فرق کا قائل ھے۔
اس نظریہ پر اس کی دلیل یہ ھے کہ:طبیعی حوادث، کسی تفکر اور تعقل کے بغیر ھمیشہ تکرار(Repetition) ھوتے رھتے ھیں جیسے، سورج طلوع ھوتا ھے اور غروب ھو جاتا ھے، درختوں کے پتے بھار میں نکل آتے ھیں اور خزاں میں خشک ھو جاتے ھیں، اور اسی طرح اگلے سال پھر یھی صورت حال تکرار ھوتی ھے، جبکہ اس کے برعکس تاریخ نہ کبھی لوٹ کر آتی ھے اور نہ ھی تاریخی واقعات اپنا چکر پورا ھونے پر اگلے سال پھر نئے سرے سے شروع ھوتے ھیں۔ لھذا تاریخ کا سفر گول دائرہ کی شکل کا نھیں بلکہ نھایت پیچیدہ اتار چڑھاؤ کا حامل ھے۔ اس لئے کوئی تاریخی واقعہ ایسا نھیں کہ جو عین اسی اگلے واقع کی طرح دھرایا گیا ھو۔ پس تاریخ میں اتار چڑھاؤ ھے لیکن یہ لوٹ کر واپس آنے کی صفت نھیں، بلکہ تاریخ ھمیشہ آگے ھی بڑھتی رھتی ھے۔نتیجتاً کھا جا سکتا ھے کہ طبیعی واقعات سے آگاھی کے لئے ضرروی ھے کہ مورخ باھر سے ان کا مشاھدہ کرے اور انھیں دیکھے جبکہ تاریخی واقعات کی حقیقت جاننے کے لئے لازم ھے کہ مورخ ان کے اندر جھانک کر دیکھے، ان واقعات اور حوادث کے رونما کرنے والے محرکین کے افکار اور خیالات کو اپنے ذھین میں لائے یھاں تک کہ خود کو ان کی جگہ پر لا کر کھڑا کرے وغیرہ۔ اس طرح کبھی بھی تاریخی واقعات کی حقیقت کا ادراک اس وقت تک ممکن نھیں جب تک کہ ان کے پیچھے ذھنیت، افکار، خواھشات اور محرک کو مدّنظر نہ رکھا جائے۔[5]
اگرچہ اس بنیاد پر کالینگووڈ، ھگل کے دلائل کے ساتھ کسی حد تک متفق ھے لیکن وہ ان کے اندر کچھ اصلاحات کا خواھشمند بھی ھے کہ جن کا بیان موضوع تحقیق سے ھم آھنگ نہ ھونے کے سبب نظرانداز کیا جاتا ھے۔ البتہ یہ حقیقت اپنی جگہ پر ناقابل انکار ھے کہ طبیعی عمل (Natural Process)تاریخی عمل (Process Historical)سے مختلف ھے۔ کیونکہ زمین شناسی کا علم، ھمیں روی زمنین پر رونما ھونے والے تمام واقعات اور حوادث سے آگاہ کرتا ھے جبکہ علم تاریخ اس کے برعکس صرف انسان اور اس سے مربوط امور تک محدود رھتا ھے کیونکہ اگر یہ علم بھی وھی کام کرے جو زمین شناسی کے دائرہ میں آتاھے تو اس وقت یہ علم تاریخ نھیں کیونکہ ھگل کے بقول دنیا میں کسی شے کی تاریخ، تاریخ کھلوانے کی حق بجانب نھیں مگر انسان کی تاریخ کہ جو عقل و فکر کا حامل ھے۔[6] یوں طبیعت اور تاریخ کے درمیان فرق کو نہ ماننا مختلف علوم کی ترتیب (Classification) کو مشکل سے دچار کر دیتا ھے۔ کیونکہ جھان شناسی اور زمین شناسی جیسے علوم پورے عالم طبیعت اور زمین کی قدامت کو زیربحث لاتے ھیں جبکہ تاریخ ایسی نھیں، اس لئے کہ اگر تاریخ کا موضوع ھم زمین کا ماضی تصور کر لیں تو پھر تاریخ، زمین شناسی اور جھان شناسی کے درمیان فاصلہ اور ان کی حدود و قیود صحیح طریقے سے بیان نھیں ھو پائیں گی۔ اسی لئے بڑے بڑے مورخین جیسے ھگل، کروچہ اور کالینگووڈ تاریخ اور طبیعت کے درمیان فرق کے قائل ھیں۔
البتہ خود مورخین کے ھاں یہ بات بھی وضاحت طلب ھے کہ علم تاریخ اور مورخین انسان کی کس بات اور کن عوامل کو موضوع بحث قرار دیں؟ اس کے جواب میں کالینگووڈ کھتا ھے کہ لوگوں کے افعال اور ماضی میں انجام دئے گئے امور وغیرہ کو۔[7] جبکہ یہ تعریف بھی مورد تنقید قرار پاتی ھے کیونکہ مکتب آنال (اور خصوصاً لوسین فور) نے کھا کہ اگر مورخین تاریخی نفسیات کے علم سے عاری ھو کر تاریخی موضوعات کا تجزیہ اور تحلیل کریں گے تو حوادث تاریخی کی اصل حقیقت تک رسائی حاصل نھیں کر پائیں گے کیونکہ دامن تاریخ میں، انسانی زندگی سے مربوط بھت ساری ایسی تاریخیں ھیں کہ جو ابھی تک نظر انداز کی گئی ھیں جیسے: تاریخ عشق، تاریخ رحم و بے رحمی اور اسی طرح تاریخ خوشی یا غم وغیرہ کہ جو اگرچہ انسان کے ساتھ مربوط تو ھیں لیکن ان کا کھیں ذکر نھیں ملتا ھے۔ لھذا انسان کے احساسات اور جذبات تاریخی تحقیقات سے ابھی تک باھر تصور کئے جاتے ھیں کہ جن پر کسی طرح کی کوئی تاریخ نھیں لکھی گئی ھے۔[8] اگرچہ سوال کہ انسانی زندگی کے کس

شعبے کو تاریخی موضوع بنایا جائے اور کس شعبے کو نظر انداز کیا جائے؟ ابھی تک تشنہ ھے کیونکہ مورخین اس کے بارے میں کوئی آخری اور قطعی فیصلہ دینے کے قابل نہیں ھوپائے ھیں۔ البتہ موضوع تاریخ کے حوالے جو بات تمام مورخین کے ھاں مشترک ھے وہ یہ کہ علم تاریخ کا موضوع انسان ھے اور اس مقالہ میں اسی مشرک نکتہ پر اکتفا کرتے ھوئے اس شعبے میں مورخیں کے نزاع اور اختلافات کے بیان کو نظر انداز کیا جاتا ھے۔

موضوع کے عنوان سے تاریخ شناسی دیگر انسانی علوم (Humanism)کے ساتھ اشتراک رکھتی ھے، جبکہ روش کے عنوان سے تاریخ ایک ایسا علم ھے کہ جو دیگر تمام انسانی علوم سے منفرد ھے۔ کیونکہ تاریخ شناسی کی روش حقیقت ، استناد اور اثبات کی روش ھے یعنی یہ علم حقیقت، واقعیت اور عملی علم ھے کہ جو نہ فقط تاریخی حقایق کو بیان کرتا ھے بلکہ نئے حقایق کو جنم بھی دیتا ھے۔مثلاً جب مورخین کے پاس جو تاریخی خبر مختلف ذرائع سے ماضی کی پہچان حاصل کرنے کے لئے پہنچتی ھے وہ صرف اور صرف اطلاعات اور مفروضہ (Data) ھوتا ھے کہ جس کے بارے میں شروع ھی میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ غلط ھے یا صحیح۔ کیونکہ تاریخ کے دامن میں اس کے بارے میں قضاوت کرنے کا امکان اتنا واضح اور آشکار نہیں ھوتا کہ ھر کوئی فوراً اس کے بارے میں فیصلہ سنا دے۔ لھذا یھاں سے مورخین کا کام شروع ھوتا ھے اور وہ کام یہ ھے کہ مورخین اس مفروضے یا تاریخی خبر (Data) کو حقیقت (Fact) میں تبدیل کر کے دکھائیں۔

اس راہ میں مورخین کے پاس جو سب سے مضبوط ھتھیار ھے وہ تاریخی عقل ھے۔ عقل تاریخی سے مراد یہ ھے کہ تاریخی حوادث اور اسناد کے بارے میں عقلمندانہ فیصلہ کرنا۔ اس میں تاریخی شواھد، قرائن، اسناد اور مکتوبات جمع کئے جاتے ھیں اس کے بعد ان کا تجزیہ ، تحلیل، جرح(Mayhem) اور تغیر و تبدل (Modification) کیا جاتا ھے کہ جن کی بنیاد پر انسانی تاریخ کے بارے میں قضاوت کی جا سکے۔ اس بنا پر کھا جا سکتا ھے کہ تاریخی عقل وہ عقل ھے کہ جس کا طریقہ کار انسانی حوادث اوران کے تاریخی واقعات کے بارے میں طبیعی، منظم ، مادی اور سائنسی ھوتا ھے۔ ایسی عقل کہ جو طبیعی اسباب اور وجوھات پر اکتفا کرتے ھوئے انسانی زندگی سے مربوط تاریخی موضوعات کی چھان بین کر سکے۔ یھی وجہ ھے کہ عقل تاریخی اور عقل غیر تاریخی (عقل محض) ممکن ھے کہ تاریخی موضوعات سے مربوط ایک جیسی قضاوت نہ کر پائیں یا یہ کہ ممکن ھے غیر تاریخی عقل کسی واقعہ کے بارے میں مثبت فیصلہ سنائے جبکہ عقل تاریخی عین اسی وقت اس کے برعکس۔ مثال کے طور پر اگر کسی تاریخی کتاب میں یہ بات آئی ھو کہ سلطان محمود غزنوی نے دس لاکھ فوجیوں کے ھمراہ ھندوستان پر حملہ کیا تھا۔ یہ مفروضہ ممکن ھے عقل محض کے نزدیک صحیح اور درست تصور کیا جائے لیکن تاریخی عقل اس کو اتنی سادگی کے ساتھ تائید نہیں کر سکتی۔ کیونکہ تاریخی عقل، عقل محض کے برخلاف صرف ایک واقعہ کے رونما ھو جانے پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ اس واقعہ سے مربوط مفروضات کو تاریخ کے تراوزو پر رکھ کر ایسے فلٹر (Filter) سے گزارے گی کہ جن میں تاریخی شرائط اور اس کے وقوع پذیر ھونے کے امکانات کو ملحوظ خاطر رکھا جائے گیا ھو اور یہ سارا پراسس کرنے کے بعد اس واقعہ کے بارے میں کوئی فیصلہ دے گی۔ لھذا تاریخی شرائط اور حادثے کے رونما ھونے کی شرائط ھمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتیں کہ اس کو صرف عقل تاریخی کے تناظر میں تجزیہ کرتے ھوئے فیصلہ سنا دیں بلکہ بھت سارے تاریخی دلائل، عوامل اور وجوھات اس بات کی طرف اشارہ کرتے ھیں کہ سلطان محمود غزنوی کے پاس تعداد کے اعتبار سے اتنی بڑی فوج کا ھونا ناممکن اور محال تھا۔

دوسری طرف تاریخی عقل کے بارے میں اس نکتہ کو بھی اس تحقیق کا اصلی مسئلہ شمار کیا جا سکتا ھے کہ کلامی نکتہ نظر کا امام شناسی کے بارے میں تاریخی نکتہ نظر کے ساتھ کس حد تک تعلق ھے اور ان کا آپس میں کیا رابطہ ھے جبکہ تاریخی عقل وہ عقل ھے کہ جو سائنسی طریقہ کار سے تاریخی مفروضات، حوادث اور واقعات کی طرف نگاہ کرتی ھے۔ دوسرے لفظوں میں تاریخی عقل

مابعداز طبیعت کے حوادث، واقعات اور تجزیات کو بیان کرنے سے قاصر ھے کیونکہ تاریخی عقل صرف از صرف انسانی زندگی سے مربوط اس موضوع کو زیربحث لاتی ھے جوکہ طبیعی انسانی اور سائنسی ھو۔ اس کی وجہ بالکل واضح ھے اور وہ یہ کہ مورخین کے پاس ایک تاریخی سند کی تحقیق کے لئے جتنے بھی ابزار، طریقے اور ذرائع ھیں وہ سب کے سب انسان کی مادی اور معاشرتی زندگی پر اطلاق کرتے ھیں۔ لھذا مورخین سے کبھی بھی انسان کے مابعد ازطبیعت سے مربوط مسائل کی تفسیر کی توقع نھیں رکھی جا سکتی کیونکہ وہ ایسے تاریخی طریقہ کار کے پابند ھوتے ھیں جوکہ ھمیشہ زمینی، انسانی، طبیعی، منظم اور سائنسی ھیں۔

اب سوال یہ پیدا ھوتا ھے کہ علم تاریخ کی انتھا کیا ھے؟ کیا یہ علم اپنی آخری منزل پر دوسرے علوم کے ساتھ اشتراک کا حامل ھے بھی یانھیں؟ اس کا جواب یہ ھے کہ علم تاریخ اپنی تھہ میں یقیناً دیگر علوم کے ساتھ مشترک ھے کیونکہ اس علم کی انتھا بھی دیگر علوم کی طرح حقیقت کی تلاش اور اس تک رسائی حاصل کرنا ھے یا با الفاظ دیگر ماضی میں انجام دئے گئے انسانی اعمال کی شناخت حاصل کرنا ھے۔ البتہ یہ جاننا کہ علم تاریخ کیسا علم ھے اور کیا یہ ممکن ھے کہ اس علم کے ذریعے شناخت مطلق اور حقیقت تک رسائی حاصل کی جا سکے یا یہ کہ یہ علم فقط قیاس اور موازنہ تک محدود رھتا ھے؟ یہ ایسے موضوعات ھیں کہ جو علم تاریخ کی انتھا اور غایت کے باب میں نھایت اھمیت کے حامل ھیں مگر یھاں پرا ن کا بیان ضروری نھیں لھذا ان سے صرف نظر کرتے ھوئے اصلی موضوع کی طرف توجہ دیتے ھیں لیکن تاریخ کی انتھا کے ضمن میں صرف ایک نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ھوئے آگے بڑھتے ھیں اور وہ یہ کہ مورخین اپنی تاریخی معرفت کی بنیاد پر جس بات کو اپنی آخری منزل قرار دیتے ھیں وہ یہ ھے کہ وہ تطبیق، قیاس اور موازنہ کے ساتھ ساتھ انسانی تاریخ سے حقیقی معرفت یا معرفت مطلق کی تلاش بھی کرتے رھتے ھیں۔

## 3۔ علم کلام کی تعریف اور اس کا دائرہ کار

فارابی اس علم کی تعریف کرتے ھوئے کھتا ھے کہ" کلام کا پیشہ، ایک ایسا ھنر اور مھارت ھے کہ جس کی مدد سے انسان بات چیت کے ذریعے ان تمام محدود اور معین افعال و آراء کی مدد کرے کہ جنھیں بانی شریعت نے واضح اور صاف صاف بیان فرما دیا ھے اوراسی طرح جو کچھ بھی ان آراء اور افعال کے برخلاف ھو اسے رد کر دے[9]۔ ابن خلدون نیز اس علم کی تعریف کرتے ھوئے کھتا ھے کہ " علم کلام ایک ایسا علم ھے جوکہ عقلی دلائل کے ذریعے ایمانی اعتقادات کے اثبات اور اھل بدعت یا بدعت گزاروں کے انحرافات کو مذاھب سلف اور اھل سنت کے ان عقائدسے دور کرنے یا رد کرنے پر محیط ھے کہ جن کے تمام تر قوانین اور قواعد کا مجموعہ توحید ھے[10]۔

علم کلام کی سادہ اور عام فھم تعریف یہ ھے کہ یہ، وہ علم ھے کہ جس کے ذریعے دینی مصادر کی چھان بین کے ذریعے اعتقادی مسائل پر درست اور صحیح قیاس کیا جا سکے[11]۔ علم کلام کے ماھرین (متکلمین) کی سب سے اھم خواھش یہ ھے کہ وہ دینی عقائدکو ثابت کریں، ان سے متعلق صحیح فیصلہ کرتے ھوئے ان کا دفاع کریں۔ لھذا علم کلام اھم ترین فرض دینی اعتقادات کا دفاع کرنا سمجھا جاتا ھے یھی وجہ ھے کہ اس علم کے ھاں دفاع کرنے قدرت کافی زیادہ مضبوط ھے۔ پھلی اور دوسری صدی ھجری میں اس علم کی شکل و صورت کچھ اس طرح تھی کہ علم کلام دینی تعلیمات اور فرمایشات کا دفاع کیا کرتا تھا[12] جبکہ علم فقہ (Religious Jurisprudence) اس کے برعکس تفھیم دین کے لئے کوشاں تھا، یھی وجہ ھے کہ علم کلام یا علم منطق ھمیشہ اپنے رقیب سے مقابلے کے لئے تیار دکھائی دیتے تھے۔ لیکن تیسری صدی ھجری کے بعد علم کلام کے اندر ایک تبدیلی پیدا ھوئی اور وہ یہ کہ یہ علم دین کے دفاع سے، دینی نظریات کے مسائل (Religious Theoretical Issues ) میں دلچسپی لینے لگا اور عمل وغیرہ کے مسائل کو فقھاء کے حوالے کر دیا یہ بات سبب بنی کہ علم کلام آھستہ آھستہ علم عقائداور اصول دین کے علم میں تبدیل ھو گیا۔

آگے چل کر ایک اور بڑی تبدیلی جو اس علم کے اندر رونما ہوئی وہ یہ تھی کہ اس علم نے اپنی دفاعی حیثیت کے ساتھ ساتھ، دین کے بیان کی ذمہ داری بھی خود اپنے ذمے لے لی۔ اس طرح دینی اعتقادی اصولوں کی تفہیم، جوکہ پہلے دینی فقہاء کی ذمہ داری تھی اب تیسری ھجری سے وہ بھی متکلمین کے فرائض میں شامل ہو گئی۔ تیسری صدی ھجری سے لے کر دسویں صدی ھجری تک علم کلام نے اپنے فرائض میں یہ شامل کیا ہوا تھا کہ وہ دین کے دفاع کے ساتھ ساتھ دینی عقائدکو دلائل کے ذریعے ثابت بھی کرے گا۔ لھذا علم کلام میں رونما ہونے والی تمام تر تبدیلیوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ھے کہ علم کلام دینی عقائدکا علم ھے۔ اس بنیاد پر علم کلام کے بارے میں یہ رائے بھی قائم کی جا سکتی ھے کہ یہ وہ علم ھے جو ایک دینی عقیدے، آئین یا مذھب کا دفاع کرتا ھے۔ علم کلام کی یہ خصوصیت کسی حد تک علم فلسفہ کے ساتھ بھی ملتی جلتی ھے۔ کیونکہ اگر خدا اور کائنات وغیرہ کے بارے میں ہر دین و مذھب کی قید سے باھر نکل کر آزادانہ ماحول میں بحث ہو اور یہ شرط بھی نہ ہو کہ اس بحث کا نتیجہ ہر صورت میں کسی نہ کسی دین کے موافق ہو تو ایسی بحث اور آئیڈیالوجی کو فلسفہ کھا جاتا ھے۔ لیکن اگر یہ بحث کسی بھی دین کی حمایت یا کسی دوسرے دین کی مخالفت کے پیش نظر ہو اور اس کے ساتھ ساتھ دینی دائرہ کے اندر رھنے کی پابند بھی ہو تو ایسی بحث اور تحقیق کو علم کلام کھا جاتا ھے۔

سوال یہ ھے کہ علم کلام کا دینی عقائدکے اثبات اور دفاع کے حوالے سے کیا طریقہ کار ھے؟ اس کا جواب یہ ھے کہ علم کلا م ایسام علم تصور کیا جاتا ھے کہ جو کسی ایک روش کا پابندنھیں بلکہ کئی ایک روشوں (Polymethodic) پر مشتمل ھے اور ان روشوں سے استفادہ کے ضمن میں کسی بھی محدودیت کو قبول نھیں کرتا بلکہ ہمیشہ موضوع کی مناسب کے پیش نظر وہ اپنی روش بھی بدل لیتا ھے تاکہ اپنے مدعا کو بھترین انداز سے ثابت کر سکے۔ اس طرح سے علم کلام میں برھان( logic or Argument) اور جدل (Disputant or Polemical) سے استفادہ کیا جاتا ھے۔ علم کلام کی روش میں تنوع (Diversity) صرف استدلال کے حوالے ھی نھیں بلکہ متن اور مواد کے اعتبار سے بھی ھے۔

علم کلام کے بعض موضوعات جیسے: نبوت اور قیامت کی خصوصیات وغیرہ کو قرآن و سنت کی مدد سے ثابت کرتے ھیں، اس لئے اسے علم کلام نقلی کھاجاتاھے۔اس کے علاوہ علم کلام کی بھت ساری دیگر مباحث بھی ھیں جیسے اللہ تعالی کی ذات اور اوصاف کو ثابت کرنا، نبوت عامہ اور اصل معاد وغیرہ کے اثبات کے لئے قیاس ، تکرار اور بحث و مباحثہ وغیرہ کہ جن کی بنیاد عقلی انصاف تصور کرتے ہوئے اسے کلام عقلی کھتے ھیں۔ متکلمین دینی عقائدکے استنباط میں دو منابع (عقل اور وحی) کا سھارا لیتے ھیں۔البتہ ان دو منابع سے استفادہ کے حوالے سے بھی مختلف ترجیحات ھیں۔ کچھ متکلمین جیسے معتزلہ وغیرہ اس قدر آگے نکل گئے ھیں کہ تمام اعتقادی معارف کو عقلی سمجھتے ہوئے، وحی الھی کو صرف عقلی فیصلوں کی تائید تک محدود کر دیتے ھیں۔ یعنی ان کے نزدیک جو فیصلہ عقل کر دیتی ھے وحی آکر اسی کی تصدیق کرتی ھے اور بس۔ جبکہ کچھ دوسرے متکلمین جیسے اشاعرہ وغیرہ تمام واجبات کو حتی کہ معرفت خدا کے وجوب کو بھی اور اسی طرح ہر طرح کے حسن و قبح کو نقل سمجھتے ھیں۔[13]

بہرحال ماھرین علم کلام روش کو اپنے مدعا کی حقانیت کے اثبات کے لئے ھتھیار تصور کرتے ھیں اگرچہ وسیلہ جو بھی ہو، اس سے فائدہ حاصل کرنا ہر صورت میں جائز سمجھا جاتا ھے۔ یھی وجہ ھے کہ علم کلام کے ماھرین آج تک ان تمام روشوں اور طریقوں سے جوکہ مختلف علوم میں مدعا کے اثبات کے لئے بروئے کار لائی جاتی ھیں، استفادہ کرتے رھتے ھیں کہ جن میں فلسفی روشیں، سائنسی روشیں، تاریخی روشیں اور تفسیری روشیں وغیرہ شامل ھیں۔ ابھی تک جو کچھ علم کلام کے موضوع اور اس کی روش کے حوالے سے کھا گیا ھے اس کو سامنے رکھتےہوئے یہ نتیجہ نکلتا ھے کہ علم کلام کا ھدف دین کی ساخت کا دفاع کرنا ،عقائداور دینی تعلیمات کی صحیح معرفت حاصل کرنا ، انھیں ثابت کرنا اور ان کا ہر طرح کے شبھات کے مقابلے میں دفاع کرنا وغیرہ ھے۔

## 4. آئمہؑ کا ثبوتی اور اثباتی مقام

مسلمانوں میں بالخصوص شیعیان علیؑ کے عقائدکے مطابق رسول خدا کے بارہ خلفاء(جانشین) کہ جنھیں شیعہ مکتب فکر میں آئمہ طاہرینؑ کہا جاتا ہے، مقام اثباتی [14]، کے ساتھ ساتھ، مقام ثبوتی [15] کے حامل بھی ہیں۔ مقام ثبوتی وہ مقدس، آسمانی اور معنوی شان و منزلت ہے کہ جو اللہ تعالی اپنے خاص بندوں کو عطا کرتا ہے اور اس شان کے پیش نظر انھیں مخصوص اور منفرد قدرت اور خصوصیات عطا فرماتا ہے۔ منفرد خصوصیات سے مراد یہ ہے کہ کسی انسان کا صاحب معجزات اور کرامات ہونا، علم غیب سے واقف ہونا، معصوم عن الخطاء ہونا اور ان سب سے بڑھ کر اللہ تعالی کی زمین پر اللہ تعالی کا منتخب شدہ نمائندہ ہونا کہ جو خلق اللہ کو راہ خدا کی طرف ہدایت کرنے کا ذمہ دار ہو۔ لھذا شیعہ کے نزدیک آئمہ طاہرینؑ ھی ایسے انسان ہیں کہ جو انبیای الھی کے بعد ایک طرف تو انسانی صفات کے مالک ہوتے ہوئے عام انسانوں جیسے ہیں، لھذا اکثر و بیشتر انھی بشری صفات کے پیش نظر دنیاوی زندگی بسر کرتے ہیں اور اپنے اعمال انجام دیتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بعض مخوص مقامات پر ضرورت کے وقت معنوی، قدسی اور الھی صفات کے بھی حامل ہو جاتے ہیں کہ جن کی مدد سے رسالت الھی کی انجام دھی میں ان سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ لھذا جب ضروری ہو جاتا ہے تو اس وقت وہ معجزہ یا کرامات وغیرہ بھی کرکے دکھاتے ہیں تاکہ منکرین دین کو اللہ تعالی کے دین کی جانب متوجہ کریں اوران پر واضح کریں کہ ہم وہ انسان ہیں کہ جن کے پاؤں تو زمین پر ہیں لیکن سرپر آسمان و زمین کے مالک کا خاص لطف ونظر ہے۔

اس طرح یہ وہ انسان ہیں کہ جو بندوں اور خدا کے درمیان رابطہ اور واسطہ ہیں کیونکہ یہ پیغام خدا کو وحی اور الھام کی صورت میں دریافت کرتے ہیں اور بغیر کسی کمی یا زیادتی کے خلق خدا تک ابلاغ کرتے ۔ لھذا امام کی شخصیت کے اس پہلو کو مقام ثبوتی کھتے ہیں۔ اسی طرح یہ وہ انسان ہیں کہ جو تمام بشریت کے لئے اور خصوصاً مؤمنین کے لئے اسوہ، مقتدا اور با عمل پیشوا کی حیثیت رکّھتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی گفتار اور کردار ہم انسانوں کے لئے حجت اور سبب ہدایت اور ذریعہ نجات ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے کہ آئمہ طاہرینؑ کی زندگیوں کے تمام شعبہ جات امت کے لئے بھترین نمونہ اور قابل تقلید ہیں کہ جن کو اختیار کرتے ہوئے انسان سعادت دارین حاصل کر سکتا ہے۔ لھذا آئمہ طاہرینؑ کی زندگیوں کے اس حصے پر نگاہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ حقیقت میں اس قابل ہیں کہ ان کی اطاعت اور پیروی کی جائے۔

## 5.تاریخی نکتہ نظر سے تاریخ شناسی اور علم کلام کے مابین رابطہ

جوکچھ مذکورہ بالا سطور میں کہا جا چکا ہےاس کے پیش نظر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علم کلام زیادہ تر آئمہ طاہرینؑ کے مقام ثبوتی اور اس کا امام شناسی کے ضمن میں بیان ہے جبکہ علم تاریخ ان کے مقام اثباتی کو موضوع بحث قرار دیتے ہوئے اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ ان کی زندگیوں کو عام انسانوں کے ساتھ ہم آھنگ، طبیعی اور تاریخ مند بیان کرے۔ لیکن مسئلہ یہ ہےکہ امام شناسی، ایک ذو مطالعاتی موضوع ہے اس لئے آئمہ طاہرینؑ کی زندگیوں سےمربوط ایک بھترین تحقیق انجام دینے کے لئے ضروری ہے کہ مورخین اور متکلمین ایک دوسرے کی علمی مدد کریں کہ جس کی وضاحت ہم آگے چل کر کریں گے۔ ان سطور کے مؤلف کی نظر میں آئمہ طاہرینؑ کی ذات کے بارے کوئی تاریخی تحقیق انجام دینے کے لئے علم کلام اور علم تاریخ کا ایک دوسرے کے لئے معاون و مدد گار ہونا ضروری ہے۔ دوسرے الفاظ میں مؤلف کی نظر میں علم کلام اور علم تاریخ امام شناسی کے حوالے سے ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں کیونکہ ان دونوں علوم کے باھمی ربط سے ھی یہ موضوع صحیح طریقے سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر ان دو علوم میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز کر کے امام شناسی پر بات کریں گے تو وہ بات ادھوری ہوگی اور اس طرح امام شناسی کے

ذیل میں بھت سارے سوالات کے جوابات نھیں دے پائیں گے لھذا فریقین مجبور ھیں کہ اس باب میں وہ ایک دوسرے کی مدد کریں۔
جب ان دونوں علوم کے دانشور ایک دوسرے کی علمی معاونت پر رضامند ھو جائیں تو دوسرے قدم پر ان کی ذمہ داری یہ بنتی ھے کہ وہ مذکورہ بالا دونوں علوم کے مابین نسبت اور تعلق کا دفاع کریں کیونکہ یہ نسبت امام شناسی کے موضوع کو مکمل کرنے والی ھے ناکہ موضوع کے ذیل میں ایک دوسرے کے عیب چننے والی۔ اس مقام پر سوال پیدا ھوتا ھے اور وہ یہ کہ کیوں اور کس طرح یہ نسبت ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والی ھے اور تنقیض کرنے والی نھیں؟ جواب یہ ھےکہ علم تاریخ اور علم کلام دونوں ایک ھی ھدف کے حصول میں کوشاں ھیں اور وہ ھے امامؑ کی صحیح شناخت۔ ایسا امام کہ جو دو صفات (شان ثبوتی اور شان اثباتی) کا حامل ھے اور یہ دونوں صفات ملکر اسے ھر طرح کی نقص و عیب سے محفوظ رکھتے ھوئے ایک انسان کامل کے مقام تک پھنچاتی ھیں۔
دوسرے الفاظ میں مقام ثبوتی اور مقام اثباتی ایک ذات میں اکٹھے ھوگئے ھیں تاکہ اسے کمال کی منزل تک پھنچا دیں۔ اس لئے کیسے ممکن ھے کہ ایسے انسان کی معرفت حاصل کرنے کے لئے، دو علوم( علم تاریخ اور علم کلام) کے اشتراک سے کوئی تحقیق انجام نہ دی جا سکتی ھو؟ یعنی یہ وہ تحقیق ھے کہ جس کا مقصد امامؑ کی ذات میں موجود دونوں صفات کی ایک وقت میں ایک مقام پر کامل ترین معرفت اور آگاھی حاصل کرنا ھے۔ دوسرےالفاظ میں یہ کہ جب ایک انسان میں دو مختلف علوم سے مربوط صفات کی شناخت کریں گے تو اس وقت ضروری ھو جائے گا کہ اولاً ان دونوں علوم کو ایک ساتھ ملا کر تحقیق کی جائے اور دوسرا یہ کہ محقق یا محققین دونوں علوم پر مکمل عبور رکھتے ھوں۔وگرنہ یہ محال ھوگا کہ دو مختلف علوم سے مربوط صفات کے حامل انسان کی شناخت کسی ایک علم کی مدد سے کی جائے۔اس لئے ضروری ھے کہ ھر صفت کی صحیح پھچان کے لئے اس سے مربوط علم میدان میں آکراپنا فریضہ انجام دے اور اسی طرح امام شناسی سے مربوط علوم بھی ضرورربالضرور ایک دوسرےسےمدد لیں۔ اگر ھم یہ گمان کر ھی لیتے ھیں کہ نھیں ایسا ممکن نھیں ھے اور اگر ایسا ھوا تو یقیناً اختلاف پیدا ھو گا، سوال ، وہ کونسا اختلاف ھے جو اس کے ضمن میں پیدا ھو سکتا ھے؟
یھاں پر ھم ایک بات فرض کر لیتے ھیں کیونکہ فرض محال تو محال نھیں ھے، ممکن ھے یہ اختلاف سامنے آئے کہ جو ایک طرف علم کلام سے جڑا ھوا ھو اور دوسری طرف علم تاریخ سے، ایسے میں کیا کیا جائے؟ اس کا جواب یہ ھے کہ آئمہ طاھرین کے بارے معرفت کی بنیاد اگرچہ اعتقادات کلامی کی بنیاد پر ھی کیوں نہ ھو ، علم تاریخ کے ضمن میں شمار کی جائے گی۔ کیونکہ علم کلام سےمربوط مفروضات بھی مؤرخین کی تائید کے نیازمند ھیں۔ دوسرے الفاظ میں علم کلام کوئی ایسا دعوای نھیں کر سکتا کہ جس کی علم تاریخ تائید نہ کرتا ھو۔ کیونکہ کلام جس قدر دینی اعتقادات اور ان کے دفاع کے بارے میں کوئی بات کرتا ھے وہ درحقیقت انسان کی گذشتہ زندگی سے مربوط ھے، اور جو کچھ بھی ماضی سےمربوط ھے وہ علم تاریخ میں آتا ھے لھذا علم کلام نے اپنا مدعا علم تاریخ سے لیا ھوتا ھے۔ اس لئے تمام تر دینی دعوے اور واقعات کہ جو گذشتہ سے مربوط ھیں ، ان کی تصدیق کےلئے ضروری ھے کہ پھلے مورخین اس کی تائید کریں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی متکلم یہ دعوای کرتا ھے کہ : حضرت محمد (ص) اللہ تعالی کے پیغام کے امین تھے۔ اس بات کی تصدیق کے لئے ضرروی ھے کہ مورخین کی تائید حاصل کی جائے ورنہ متکلم کسی بھی صورت میں نہ تو اس بات پر دوسروں کا اعتقاد استوار کر سکے گا اور نہ ھی اس کی حقانیت کو ثابت کر پائے گا۔ یہ بات اس وقت درست کھی جا سکتی ھےکہ جب مورخین اس کے حق میں رائے دیں اور اس کی تاریخی نکتہ نظر سے تصدیق کریں۔ یھی وجہ ھے کہ دین اسلام کو دین تاریخی بھی کھا جاتا ھے۔
جب علم تاریخ دین کی مدد کرتا ھے تو اس وقت ھرطرح کے افسانے، من گھڑت قصے اور غیر تاریخی اعتقادات اس سے کوسوں دور ھو جاتے ھیں۔ اور یہ وہ مقام ھے کہ جھاں پر یہ دعوای کیا جا

سکتا ھے کہ ایک حوالے سے علم کلام بھی علم تاریخ کے ذیل میں آتا ھے کیونکہ متکلم امامؑ کی شان ثبوتی کے اثبات کے لئے تاریخ کا محتاج ھے ، جبکہ مورخ امامؑ کی شان اثباتی کو ثابت کرنے کے لئے متکلمین کی تائید کا محتاج نہیں ھے۔ لھذا جوکچھ شان امامؑ کی شان ثبوتی کے حوالے سے کہا جاتا ھے اگروہ زمان ماضی سے متعلق ھوگا تو یہاں پر مورخ صاحب اختیارھے کہ وہ اسےتاریخی طریقہ کار کے پیش نظر قبول کرے یا رد کر دے۔ اس بناپر اگر کبھی ھم اس حد تک مجبور ھو جائیں کہ علم کلام یا علم تاریخ میں سے کسی ایک کی خبر کو قبول کریں تو بھتر ھے تاریخی خبر کو اولویت دی جائے۔ علم تاریخ کی علم کلام پر اس برتری کے علاوہ جوکہ معرفت شناسی کے ذیل میں ھے، اور بھی بھت سارے مقامات ھیں کہ جھاں پر علم تاریخ علم کلام پر فوقیت رکھتا ھے کہ جن میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ھیں:

**الف:** جیسا کہ بیان ھو چکا ھے کہ امام شناسی کے ضمن میں علم تاریخ زیادہ تر مقام اثباتی پرتاکید کرتا ھے جبکہ علم کلام مقام ثبوتی پر ، اس طرح اگر آئمہ طاھرین کی معاشرہ میں بسر کی گئی زندگی پرنظر کریں تو معلوم ھوگا کہ ان کی ساری زندگی نظام فطرت کے عین مطابق، عام انسانوں جیسی تھی مگر یہ کہ بعض اوقات ضرورت کی وقت انھوں نے معمول سے ھٹ کر اپنی آسمانی طاقت اور قدرت کا اظھار کیا ھو۔ دوسرے الفاظ میں ان کی زندگیوں کے زیادہ امور مقام اثباتی سے متعلق تھے جوکہ بالکل قابل درک و فھم تھے، جبکہ چند ایک امور مقام ثبوتی کے ذیل میں بھی ملتے ھیں۔ اس تاریخی حقیقت سے جو نتیجہ نکلتا ھے وہ یہ ھے کہ آئمہ طاھرین کی زندگی اورسیرت کے ساتھ تاریخی نکتہ نظر ،کلامی نکتہ نظر کی نسبت زیادہ ھم آھنگ ھے کیونکہ ان کی زندگی کا دستور ایک معتدل انسانی زندگی بسرکرنا تھا۔ اس لئے ان کی زندگیوں کا زیادہ تر حصہ تاریخ سے متعلق ھے ۔ یعنی ھم ان کے ایک ایک کام اور ایک ایک بات کو تاریخی طرز تحقیق سے اثبات کر سکتے ھیں۔ اس کے ذیل میں اگر چند ایک مافوق انسانی امور جیسے معجزہ اور کرامات وغیرہ آجائیں تو اس وقت تاریخ کی بجائے ان کی تصدیق علم کلام کرے گا۔

**ب:** آئمہ طاھرین کی زندگیوں کو تاریخی نکتہ نظر سے دیکھنا ھمیں اس بات کی دعوت دیتا ھے کہ ھم ان کے اعمال و گفتار کو اپنے لئے اسوہ اور نمونہ قرار دیتے ھوئے ان کی سیرت کو اپنے زمانے کے مطابق اپنی زندگیوں پر لاگو کریں۔ جیسا کہ ھم آئمہ طاھرینؑ کو اپنا رھبر اور پیشوا سمجھتے ھوئے اس بات کی کوشش کرتے ھیں کہ ان کی سیرت تمام پیروکاروں کے لئے اسوہ حسنہ اور مشعل راہ قرار پائے اور اسے عملاً ھماری زندگیوں پرنافذ ھونا چاھیے، لھذا اس حوالے سے ضروری ھے کہ ان کی سیرت طیبہ کی تاریخی نکتہ نظر سے تفسیر، تحلیل اور تجزیہ کیا جائے ۔ اور اگر اس بات کو نظر انداز کرکے لوگوں کو سیرت طیبہ پر عمل کرنے کی دعوت دیں گے تو وہ زیادہ مفید نہیں ھوگی۔ کیونکہ ان کا مقام ثبوتی، وہ مقام نہیں کہ جس کے لئے پیروکاروں کو اس پر عمل کرنے کی وصیت کی جائے۔ مثلاً ، کسی بھی وقت آئمہ طاھرینؑ نے ھم سے اس بات کا تقاضا نہیں کیا ھے کہ ھم ان سے کرامات سیکھیں اور پھر انھیں انجام دینے کے طریقے، بلکہ حقیقت ھے کہ یہ مافوق انسانی خصوصیت ھے کہ جو صرف انھی کو زیب دیتی ھے۔ لیکن اس کے برعکس انھوں نے ھمیشہ ھمیں اس بات پر تاکید فرمائی ھے کہ کبھی بھی ظلم و ستم کے سامنے چپ چاپ ھاتھ پر ھاتھ رکھ کر بیٹھ نہ جائیں بلکہ دنیا میں عدل و انصاف کو نافذ کرنے کے لئے سخت سے سخت کوششیں کرتے ھوئے ظلم کا مقابلہ کریں۔ اور یہ وہ باتیں ھیں کہ جن کو عملی جامعہ پھنانے کے لئے وہ خود بھی ھمیشہ کوشاں رھے ھیں۔لھذا صحیح طریقہ یہ ھےکہ ھم آئمہ طاھرینؑ کو انسان اور عبادالرحمن کی نظر سے دیکھیں، یعنی ایسے بندے کے جن کا سر تو آسمانوں کے ساتھ ملا ھوا ھے لیکن پاؤں زمین ھی پر ھیں۔ وہ ایسے اعمال و افعال انجام دیا کرتے تھے کہ جو آسمانی ھونے کے ساتھ ساتھ بالکل زمینی تھے کہ جن سے ایک عام انسان بھی سبق حاصل کر تے ھوئے ، اپنے لئے اسوہ قرار دے کر ان کی صحیح اطاعت و پیروی کی ذریعے دنیا و آخرت کی سعادتیں حاص کر سکتا ھے۔

**ج۔** آئمہ طاھرینؑ کی زندگیوں کو تاریخی نکتہ نظر سے دیکھنا ھمیں اس بات کا موقع بھی فراھم کرتا ھے کہ ھم ان بزگواروں کی سیرت کو عالمی ظلم و ستم کے مقابلے میں مجاھد اور (champion) متعارف کروائیں۔جبکہ ان کی شان والا کا بھی یھی تقاضا ھے کہ انھیں ایسے ھی متعارف کروایا جائے تاکہ ان بزرگ ھستیوں اور تا ابد عالمی شخصیتوں کو غیرانسانی خصوصیات اور مخصوص قسم کے ایسے اعتقادات میں محصور کرکے محدود نہ کیا جائے کہ جو صرف از صرف شیعوں کے لئے توقابل فھم و درک ھوں جبکہ دوسرے ان سے مستفید نہ ھو سکیں۔ بلکہ کوشش کریں کہ ان کی سیرت طیبہ کو دنیا کی تمام زبانوں میں بین الاقوامی سطح پر تمام حریت پسندوں ، عدل و انصاف کے طلب گاروں اور عالمی امن کے خواھشمندوں کے سامنے پیش کریں تاکہ وہ ان کی صحیح پھچان حاصل کر تے ھوئے، انھیں اپنے لئے رول ماڈل قرار دیں اور ان کے نقش قدم پر چلتے ھوئے دنیا کو امن و امان کا گھوارہ بنا سکیں۔ یھاں سب سے اھم نکتہ یہ ھے کہ ایسا امکان ھمیں صرف از صرف تاریخی طریقہ کار ھی فراھم کر سکتا ھے کیونکہ اس کی ادبیات ھر ایک کے لئے چاھے وہ کسی بھی دین و مذھب سے تعلق رکھتا ھو قابل فھم ھے۔ جبکہ کلامی روش، ایک ایسی دیدگاہ ھے کہ جس کی بنیاد صرف اس معرفت سے ھے کہ جسے حاصل کرنے کی لئے تفاسیر اور مفسرین کا سھارا لینا پڑتا ھے۔

**د۔** تاریخی روش آئمہ طاھرینؑ کی زندگیوں سےایسے ایسے عقلی و نقلی بیانات پیش کرتی ھے کہ جن سے علم و دانش کے نئے نئے باب کھلتے ھیں جبکہ کلامی روش وھی پرانے اور تکراری جوابات دھراتی رھتی ھے۔ تاریخی روش ھمیں ایسےپیچیدہ سوالات کا جواب دیتے وقت کہ جیسے: امام حسنؑ نے امیر شام سے صلح کیوں کی اور امام حسینؑ نے یزید کے مقابلے میں قیام کیوں کیا یا پھر یہ کہ امام رضاؑ نے ولایتعھدی کو کیوں قبول کرلیا جب کہ وہ دلی طور پر راضی نھیں تھے وغیرہ وغیرہ ان تاریخی تجزیات اور زمینی حقایق سےروشناس کراتی ھے کہ جو اس زمانے کی شرائط کو سمجھنے میں ھماری مدد کر تے ھیں۔ اور سائل کو ایسے جوابات دیتے ھیں کہ جن سے اسے اس حقیقت کا ادراک ھو جاتا ھے کہ آئمہ طاھرینؑ ایسے انسان تھے کہ جو بیک وقت بھترین سیاستدان، مصلح، کمال کے دانا اور آگاہ ترین افراد ھونے کی حیثیت سے ھمیشہ اپنے اپنے زمانوں کی سیاسی اور اجتماعی شرایط کا بغور مطالعہ کرتے ھوئے ، تمام جوانب کو مدنظر رکھ کر حکمت پر مبنی اقدام اٹھایا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی معنوی زندگی کے ذیل میں بھت بڑے عابد، مسئول اور اپنی دینی ذمہ داریوں کی طرف سوفیصد متوجہ تھے لھذا وہ ھمیشہ اپنے علم و عرفان کو اپنی ذمہ داریوں کو انجام دینے کے لئے بروئے کار لایا کرتے تھے یھی وجہ ھے کہ وہ بھترین وقت میں بھترین فیصلے کیا کرتے تھے وغیرہ۔

اس کے برعکس کلامی نکتہ نظر عموماً ایک جیسا اور تکراری جواب دیتا ھے اگرچہ اس کے صحیح ھونے میں کسی طرح کا کوئی شک و شبہ نھیں ھے۔ کلامی نکتہ نظر مذکورہ بالا سوالات کے جوابات عموماً اس طرح دیتا ھے کہ: " امام حسنؑ نے صلح اور امام حسینؑ نے قیام اس لئےکیا تھا کہ انھیں اللہ تعالی کی طرف سے یہ حکم دیا گیا تھا"، " وہ اپنے دینی فرائض انجام دے رھے تھے" ، " اللہ تعالی کی مرضی یھی تھی" وغیرہ وغیرہ۔ ان جوابات میں سے کوئی ایک بھی قابل انکار نھیں، سبھی ٹھیک ھیں، لیکن امام شناسی کے باب میں ایسےجوابات کو اپنے اپنے مقامات پر بیان کیا جانا چاھیے تاکہ دونوں علوم ایک دوسرے کی مدد سے امام شناسی کے ذیل میں ایک دوسرے کی مدد و معاونت کرتے ھوئے ، امام شناسی کے اس کام کو بطریق احسن انجام دے سکیں۔ لھذا ان میں سے کسی ایک کو حذف کرنے، رد کرنے یا نظرانداز کرنے سے ممکن ھے موضوع بحث تشنہ رہ جائے اور اس کا حق ادا نہ ھو سکے۔

## نتیجہ

اس تحقیق کا اصلی مسئلہ یہ تھا کہ ایک تاریخی تحقیق میں کس طرح امام شناسی سے متعلق کلامی اور تاریخی روشیں ایک دوسرے کو مکمل کرتے ھیں اور ان کا آپس میں رابطہ کیسے برقرار کیا جا سکتا ھے۔ ھم نے ثابت کیا ھے کہ یہ دو نوں علوم اپنی ماھیت اوربنیاد میں بالکل ایک دوسرے سے مختلف نھیں ھیں۔

اور اگر ان دونوں کو اپنی اپنی جگہ پر رکھ کر بروئے کار لایا جائے تو یقیناً امام شناسی کے موضوع کا صحیح حق ادا کرنے میں ایک دوسرے کے مدد گار اور معاون ھیں۔ اور ا ن میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز کرنے سے ، آئمہ طاھرینؑ کی صحیح معرفت مشکل عمل ھے۔ اس تحقیق میں ھم نے اس بات پر بھی تاکید کی ھے کہ اگر کبھی ان دو علوم کے درمیان اختلاف نظر سامنے آ جائے تو اس وقت تاریخی نکتہ نظر کو اولویت دینی چاھیے، کیونکہ علم کلام، امام شناسی کے حوالے سے، علم تاریخ کے ذیل میں آتا ھے، وہ اس طرح کہ علم کلام اپنے مدعا کی تصدیق تاریخی منابع و مصادر سے کرواتا ھے اس لئے مرکزیت علم تاریخ کو حاصل ھے ، یھاں تک کہ دینی عقائدکی تصدیق و تردید کا مسئلہ ھی کیوں نہ ھو آخری فیصلہ علم تاریخ ھی کا ھے۔

*****

## حوالہ جات

1۔ دیکھیں: فلیسین شالہ، *شناخت روش‌های علوم*، ترجمہ دکتر مھدوی، (تہران، چاپخانہ تابان، 1323) 13۔
2۔ دیکھیں: کارل پوپر، *جامعہ باز و دشمنان آن*، ترجمہ عزت اللہ فولادوند، چاپ اول ( تھران، خوارزمی، 1369) 1114۔
3۔مسعود امید، "*کانت و مسالہ تاریخ*"، سروش اندیشہ، سال چھارم، شمارہ دوازدھم و سیزدھم، ص 145۔
4۔نقل از: آر. جی. کالینگوود، *مفھوم کلی تاریخ*، ترجمہ علی اکبر مھدویان، چاپ اول، ( تھران، نشر اختران، 1385) 127۔
5۔ ایضاً، ص 148۔
6۔ ایضاً، ص 149۔
7۔ ایضاً، ص17۔
8۔ھنری استوارت ھیوز، *راہ فروبستہ*، ترجمہ عزت‌اللہ فولادوند( تھران، انتشارات علمی و فرھنگی، 1373) ندارد۔
9۔ ابونصر محمد فارابی، *احصاء العلوم*، ترجمہ حسین خدیوجم( تھران، انتشارات علمی و فرھنگی، 1364) 114۔
10۔عبدالرحمن بن خلدون، *مقدمہ ابن خلدون*، ترجمہ محمد پروین گنابادی، ج 2، ( تھران، بنگاہ ترجمہ و نشر کتاب، 1326) 932۔
11۔ دیکھیں: جرجاني، *تعریفات*( تھران،...) 162. و . EI2, "kalam", و قاضي عبدالجبار, ھمداني، *المغني*، ج7 (...) 179۔
12۔علي اصغر، حلبي، *تاریخ علم کلام در ایران و جھان اسلام*، چاپ اول ( تھران، اساطیر،1373) 35۔
13۔دیکھیں: حلبي، وھی، صفحات اور فصول مختلف۔
14۔ انسانی یا مادی مقام جوکہ تمام انسانوں کے ساتھ برابر ھے۔
15۔فرا انسانی خصوصیات یعنی معجزات اور کرامات وغیرہ کا حامل ھونا۔

## کتابیات


1) آر. جی. کالینگوود، مفھوم کلی تاریخ، ترجمہ علی اکبر مھدویان، تھران: نشر اختران، 1385 ۔
2) آشوب، ابن شھر، *مناقب آل ابی طالب*، قم: موسسہ انتشارات ،...
3) فارابی، ابونصر محمد ، *احصاء العلوم*، ترجمہ حسین خدیوجم، تھران، انتشارات علمی و فرھنگی، 1364۔
4) خلدون، عبدالرحمن بن، *مقدمہ ابن خلدون*، ترجمہ محمد پروین گنابادی، تھران: بنگاہ ترجمہ و نشر کتاب، 1326 ۔
5) شالہ، فلیسین ، *شناخت روش‌های علوم*، ترجمہ دکتر مھدوی، چاپخانہ تابان، 1323۔
6) کارل پوپر، *جامعہ باز و دشمنان آن*، ترجمہ عزت اللہ فولادوند، تھران: خوارزمی، 1369 ۔
7) امید،مسعود، "*کانت و مسالہ تاریخ*"، سروش اندیشہ، سال چھارم، شمارہ دوازدھم و سیزدھم۔
8) ھنری استوارت ھیوز، *راہ فروبستہ*، ترجمہ عزت‌اللہ فولادوند، تھران: انتشارات علمی و فرھنگی، 1373۔
9) حلبي،علي اصغر *تاریخ علم کلام در ایران و جھان اسلام*، تھران: اساطیر، 1373۔
10) جرجاني، علي بن محمد، *تعریفات*، تھران،...
11) ھمداني، قاضي عبدالجبار، *المغني*،...
12) EI2, "kalam". -
13) نعمانی، محمد ابراھیم ، *الغیبہ*، تھران: مکتبہ الصدوق، 1379۔
14) صدوق، شیخ ، *معاني الاخبار*، قم: انتشارات جامعہ مدرسین حوزہ علمیہ قم، 1361۔
15) صدوق، شیخ ،*کمال الدین و تمام النعمہ*، قم: دارالکتاب الاسلامیہ، 1359 ق۔
16) مفید، شیخ ، *تصحیح الاعتقادات الامامیہ*، بیروت: دارالمفید، 1414 ق۔
17) حلبي، ابوالصلاح، *الکافي في الفقہ*، تحقیق: رضا استادي، اصفھان: مکتبہ امیرالمومنین، 1403 ق۔

18) طوسي،محمد بن حسن، *الاقتصاد الهادي الي طريق الرشاد*، تحقيق: حسن سعيد، تهران: مكتب جامع چهل ستون، 1400 ق.